نفاق زدہ ذہنیت

اس انداز فکر کی لغویت پر عقل حیران ہے کہ کیا کہے؟ ایک چیز کو تسلیم تو فرض عین کی جارہا ہے مگر ساتھ ہی اس سے عملی تعلق کا یہ حال ہے کہ جب تک دوسرے اس کا حق ادا کر کے دکھا نہ دیں ہم اس کے لیے اپنی جگہ سے جنبش نہ دیں گے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ اگر امام ان لوگوں کے خیال کے مطابق صالح اور متقی اور مقبول الصلوۃ نہ ہو تو یہ حضرات نہ صرف یہ کہ اس کے پیچھے ہی نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے بلکہ سرے سے نماز ہی چھوڑ بیٹھیں گے اور اپنے خیال میں کل، حشر کی عدالت میں یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں گے کہ خدایا! ہم تو نماز کو فرض عین ہی سمجھتے تھے اور چوبیس گھنٹے اس کے لیے باوضو رہتے تھے مگر موذن کی اذانوں اور امام کی نمازوں میں ہم کو خلوص وللہیت کی روح نظر نہیں آتی تھی۔ اس لیے ہم نے نماز نہیں پڑھی؟ کیا غور وفکر کے باوجود بھی اس طرز فکر واستدلال کے لیے کوئی شرعی یا عقلی بنیاد فراہم کی جاسکتی ہے؟ فرض کیجیے کہ زید اقامت دین کی دعوت دے رہا ہے اور ہماری فرض شناسیوں پر جھنجوڑ کر ہمارا فرض زندگی ہمیں یاد دلا رہا ہے نیز اپنے طور پر اس راہ میں قدم بھی رکھ دیتا ہے لیکن جہاں تک اس کی عملی صلاحیت، خلوص اور عزیمت کا تعلق ہے آپ کو اس پر پورا اطمینان نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اور اس کے سارے ہم سفر آپ کو نااہل، بے عمل، غیر مخلص اور غیر متقی دکھائی پڑتے ہیں.................... تو سوال یہ ہے کہ ان کی یہ ساری خامیاں آپ کے اپنے فرض کو ساقط، اور آپ کو اپنی ذمے داریوں سے سبکدوش کس طرح کرا دیں گی؟ کیا آپ نے دین حق کی اقامت کو اپنی زندگی کا اصل فریضہ اس شرط کے ساتھ تسلیم کیا تھا کہ پہلے نرم گرم بستروں سے اٹھیں گے اور اپنی آرام گاہوں سے قدم باہر نکالیں گے؟ کیا قرآن کی مرکزی دعوت پر لبیک کہنے کے آپ اسی طرح مکلف ہیں جب دوسروں کی اس کی (مائیت میں) قربانیاں کرتے دیکھ لیں۔ اگر ایسا نہیں ہے................ اور قرآن گواہ ہے کہ ایسا ہر گز نہیں ہے................ تو خود اپنے نفس کی حیلہ سازیاں اور غفلتیں کیا کم ہیں کہ دوسروں کی کمزوریاں ٹٹولنے کی آپ کو فرصت مل جاتی ہے! دوسرے اگر فی الواقع ویسے ہی ہیں جیسا کہ آپ کا گمان ہے تو خدا کے روبرو اس کے جواب دہ وہ خود ہوں گے آپ اس کھود کرید کی زحمت، کہ کس کے اندر کیا ہے بلاوجہ کیوں اٹھائیں؟ ہر شخص کو صرف اپنے نامہ اعمال کی فکر کرنی چاہیے۔ دوسروں کی ناقابل اطمینان حالت پر اگر نظر جائے تو صرف درس عبرت کے لیے کہ حکمت و دانش کا یہی تقاضا ہے، حضرت لقمان سے پوچھا گیا کہ "آپ نے ادب کس سے سیکھا؟ جواب دیا کہ بے ادبوں سے "مومن کو بھی اللہ تعالی حکیم دیکھنا چاہتا ہے اور یہی ہی عبرت پذیر اور حکمت پسند نگاہوں سے کام لینے کی اس نے اسے تاکید کی ہے۔ سارا قرآن اس نے معضب اور گمراہ قوموں کے تفصیلی تذکروں سے اسی لیے تو بھر دکھا ہے کہ مسلمان ان کی جیسی فکری اور غلط کاریوں سے اچھی طرح باخبر ہو رہیں۔ (و لتستبین سبیل المجرمین) اور ان سے ہمیشہ بچتے رہیں۔ اس لیے اس صورت حال کا مطالبہ کہ اقامت دین کا داعی شخص یا گروہ نااہلی کا مظاہر کر رہا ہے۔ ہم سے اگر کچھ ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ ان کی خامیوں، ظاہر داریوں اور غلط کاریوں کو اپنے لیے بے عملی کی سند بنا لینے کے بجائے ان سے خود اپنے دامن کو بچائیں۔ اور پوری الہیت اور عزیمت کے ساتھ اس جھنڈے کو لے کر آگے بڑھیں۔ اس کے سوا اگر کوئی اور صحیح بات ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ ان کے لیے ہدایت، عزیمت، خلوص اور توفیق عمل کی دعا کرتے جائیں کہ ان کی چیخ وپکار اگر چہ ان کی اپنی حد تک محض "زبانی نعرہ اور بے جان دعویٰ" تھی۔ مگر ہمارے آپ کے حق میں تو وہی ہادی اور مذکر ثابت ہوئی۔ اس لیے فی الواقع وہ تو ہمارے اور آپ شکریئے کے مستحق ہیں۔ نہ کسی طنز یا مخالفت کے اس نادان اور بد نصیب انسان پر جو تاریکیوں کے ہجوم میں سر راہ چراغ لے کر کھڑا ہو اور دوسروں کو تو ان کی منزل مقصود دکھا رہا ہو مگر خود آنکھوں پر اس نے پٹی باندھ رکھی ہو۔ آپ کو افسوس تو ضرور آنا چاہیے۔ مگر اس پر بے دردانہ اعتراضات کرتے رہنا بے انصافی ہے اور اس کی پیروی کرتے ہوئے چراغ کی روشنی سے فائدہ اٹھانا حماقت اور بد بختی ہے۔ خوش بخت وہ ہے جو دوسروں سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے۔ اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ قائل کی شخصیت کے بجائے اس کے قول کو دیکھا جائے۔ "جو اللہ کی باتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں اور پھر ان بہترین

باتوں کی پیروی میں لگ جاتے ہیں۔(الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ۔ زمر:۱۸)دعوت اقامت دین" کے بارے میں اس طرح کی کوئی بحث تو ہے نہیں کہ وہ "القول" (اللہ کا قول) ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ مسلمہ طور پر "القول" ہے اس لیے بلاتامل اور بغیر توقف اس پر لبیک کہیے اور اگر ساری دنیا بھی اس کے اپنانے سے جی چرا رہی ہو تو بھی یقین رکھیے کہ اس سے آپ کی اپنی ذمے داریوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔اور نہ آپ کو یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے اخلاص وعزمت کا انتظار کرتے رہیں۔یہ انتظار تو حق پرستی کی ضد ہے اور جو شخص حق کو جان پہچان لینے کے بعد بھی انتظار کی پالیسی اختیار کرتا ہے وہ دراصل حق کی قدر ہی نہیں پہچانتا، اور اک گونہ اس کی راہ بھی روکتا ہے۔

بہت ضروری ہے اس موقع پر اس رسوائے عالم گروہ کا حال اور انجام یاد کر لیا جائے جس نے رسول ﷺ اور اصحاب رسول ﷺ کی جان فروشانہ دعوتی سرگرمیوں کے معاملے میں یہی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ جس کے لیے اس مہم میں شریک ہو جانے کے سلسلے میں یہ احساس فرض کافی نہ تھا کہ یہ لوگ جس کام کے لیے اپنی جانیں کھپا رہے ہیں اسی کو ہم نے بھی حق تسلیم کر رکھا ہے، بلکہ حق و باطل کی اس کش مکش سے دور کھڑے اس کے انجام کا اندازہ لگاتے رہتے تھے اور مسلمانوں کی جماعت میں صرف اس وقت آملتے تھے۔جب ان کی فتح کے جھنڈے لہراتے دیکھ لیتے:۔

الذین یتربصون بکم فان کان لکم فتح من اللہ قالوا الم نکن معکم(نساء:۱۴۱)

"یہ لوگ تمہارے سلسلے میں انتظار کرتے رہتے ہیں اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح مل جاتی ہے تو کہنے لگتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟"

غور فرمایئے کہ جو لوگ اقامت دین کو اپنا منصبی فریضہ سمجھتے ہوئے بھی محض دوسروں کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اس کی خاطر آمادہ عمل نہیں ہوتے۔ان کی ذہنیت کتنی قریبی مشابہت رکھتی ہے اس ذہنیت سے جس پر ان منافقوں کے طرز عمل کی بنیاد تھی؟ جس طرح وہ "منافق" حق کی حمایت حق کی خاطر نہیں کرتے تھے اسی طرح ان "مسلمانوں" کے نزدیک بھی حق کا مجرد حق ہونا ہی آمادگی عمل کے لیے کافی نہیں۔فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ وہ لوگ مسلمانوں کی فتح کا انتظار کیا کرتے تھے اور یہ حضرات اقامت دین کے داعیوں کے عزم واخلاص کے بارے میں کسی "شرح صدر" کے منتظر ہیں! لیکن اتباع حق اور ادائے فرض سے بھاگنے میں دونوں مشترک ہیں۔

ایک قدم اور آگے

کاش بات یہی تک رہتی اور انتظار وتربص کے صرف اسی پہلو پر ہی اکتفا کر لیا گیا ہوتا۔ مگر یہ دیکھ کر صبر وضبط کا دامن سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے کہ لوگ اسی حد پر رکے رہنے لیے تیار نہیں۔بلکہ خداپرستی اتباع قرآنی اور عشق محمدی ﷺ کی دعوے دار امت میں کچھ ایسے افراد بھی موجود ہیں جنہیں انتظار اس بات کا ہے کہ اقامت دین کے "جھوٹے مدعی" میدان سے کب بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور انہیں اپنے جذبات طعن وتشنیع کی تسکین دہی کا موقع کب نصیب ہوتا ہے۔یہ حضرات ایک سنجیدہ تبسم کے ساتھ فرمایا کرتے ہیں کہ یہ ہوش سے عاری اور جوش کے اندھے لوگوں کا ایک گروہ ہے جو "قیام دین" "قیام دین" کا شور مچا رہا ہے۔زمانے کے حوادث خود ہی اس کی فاتحہ پڑھ دیں گے۔اور یہ فرما کر گویا اپنی ذمے داریوں کا حق ادا کر دیتے ہیں لیکن شاید انہیں خبر نہیں کہ ان کے اس نشتر طعن کی زد خود ان کی اپنی رگ گلو تک جا پہنچتی ہے۔افسوس! مسلمانوں کا دل اب قیام دین کی مسرتوں سے بھی اس درجہ محروم ہو گیا ہے کہ اگر خود نہیں کچھ کر سکتا تو دوسروں کا کچھ کرنا بھی اس کو گوارا نہیں رہا۔آخر یہ باور کرنے کے لیے کہاں سے دل ودماغ لائے جائیں کہ جو سینہ دین حق کی محبت اور فدویت کا امین بنایا گیا تھا اب اس میں ان آرزوؤں کی پرورش کیا جا رہی ہے

جو صرف کفر و فروغ کفر کے خلاف مخصوص ہونی چاہیے تھی۔ حالانکہ اگر کسی کے اندر اتنی غیرت اور ہمت موجود نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو زندہ کرنے کے لیے قدم اٹھا سکے تو اس کے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ ہونا ہی چاہیے تھا کہ اس تمنا سے اپنے قلب و دماغ کو ایک لمحہ کے لیے بھی خالی نہ ہونے دیتا۔ اور اگر اللہ کے کچھ بندے اس کے لیے قدم اٹھا رہے ہوں تو ان کے لیے اخلاص عمل ثبات قدم، نصرت حق اور حسن انجام کی دعائیں ہی کرتا رہتا۔ لیکن اگر کوئی اتنا بھی کر سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیرت حق کی آخری چنگاری بھی اس کے اندر بجھ رہی ہے اور اگر خدانخواستہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ اس دعوت حق کو فتنہ قرار دے۔ لوگوں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے لگ جائے اور اس کے لیے حوادث روزگار کی تمنائیں کرنے لگے۔ تو اس کی بدبختی کی یہ انتہا ہو گی اور ایسی صورت میں اس کو اسلام کا نام لیتے ہوئے شرم آنی چاہیے کیونکہ اس وقت وہ ذہنیت اور طرز اظہار کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ بالکل اسی مقام پر ہو گا جہاں سے کبھی کچھ بدنصیب محمد ﷺ اور آپ کے اولوالعزم ساتھیوں کے بارے میں ہلاکتوں کی راہ تکا کرتے تھے جس کا تذکرہ قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے۔

و من الاعراب من یتخذ ما ینفق مغرماً و یتربص بکم الدوائر (توبہ:۹۸)

"اور کچھ دیہاتی ایسے ہیں جو (اللہ کی راہ میں) کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں اور تم مسلمانوں کے حق میں آفات زمانہ کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

یا پھر اس مقام پر جہاں سے پیغمبر عالم کی دلوں کو جیت لینے والی دعوت حق کو یہ کہہ کر ٹالا گیا تھا کہ :

یہ ایک شاعر ہے ہم اس کے لیے حوادث روزگار کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

لہٰذا جنہیں اللہ نے عقل دی ہے اور عقل کے ساتھ ایمان کی تھوڑی سی محبت بھی عطا کی ہے تو وہ اس خطرناک اور ایمان سوز ذہنیت کے قریب بھی نہیں جا سکتے۔

۵۔ مہدی موعود کا انتظار

آخری گروہ ان لوگوں کا ہے جو امام مہدی کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان کے فکر و استدلال کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تیس سال کے بعد خلافت راشدہ کے ختم ہو جانے کی خبر دی تھی چنانچہ وہ اس مدت پر ختم بھی ہو گئی۔ دوسری طرف حضور ﷺ یہ بھی بشارت سنا گئے ہیں کہ جب دنیا اپنی زندگی کے دن پورے کر چکنے کو ہو گی تو مرد صالح (الامام المہدی) کا ظہور ہو گا۔ جن کے ہاتھوں میں اللہ کی زمین پر خلافت علی منہاج النبوۃ کا قیام عمل میں آئے گا اور اس نقطہ آغاز کا نقطہ انجام یہ ہے کہ اس نصب العین کے برحق ہونے کے باوجود اب ہم اس کے لیے کسی جد و جہد کے مکلف ہی نہیں۔

استدلال یا فریب استدلال

دین اور اس کے اصول و مقاصد سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ اب اس قسم کی باتوں کو بھی دلیل سمجھا جاتا ہے اور دلیل بھی اتنی زبردست جو مسلمان کی زندگی کا مقصد اور رویہ ہی بدل سکتی ہے اور جس نے افیون کی گولی بن کر کتنے ہی عوام اور خواص کو اپنے فریضۂ زندگی کی طرف سے غافل اور بے حس بنا رکھا ہے۔ اس لیے یہ واضح کر دینے کی بہر حال ضرورت ہے کہ یہ دلیل نہیں ہے بلکہ نفس کا یا پھر نگاہ کا ایک فریب ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ دیکھ لیناچاہیے کہ ظہور مہدی کی خبر ہمیں ملی کہاں سے ہے ؟اور دینی حقائق کی فہرست میں اس کا مقام کیاہے۔

اس سوال کاجواب معلوم کرنے کے لیے قدرتاًہماری نگاہ سب سے پہلے قرآن پر جاتی ہے مگر اس کے صفحات کو ہم اس کے ذکر سے بالکل خالی پاتے ہیں حالانکہ دین کی اصولی تعلیمات میں اس مسئلے کو اگر کوئی ایسی اہمیت حاصل ہوتی جو ہماری زندگی کے بنیادی فریضے پر ایک فیصلہ کن انداز میں اثر ڈال سکتی ہو تو عقل عام کہتی ہے کہ قرآن اس کے متعلق ہم کو لازماًواضح ہدایتیں دیتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اس مسئلے کو دین اور دینی افکار و تصورات میں کوئی بنیادی اہمیت حاصل ہی نہیں۔ اور جب صورت واقعہ یہ ہے تو امت مسلمہ کے مقصد وجود جیسے اہم ترین معاملے کے متعلق اسے کوئی فیصلہ کرنے کا حق دینافکر و نظر کی زبردست کوتاہی ہے۔

اب قرآن کے بعد صحیح احادیث کی طرف رجوع کیجیے تو یہاں بھی اس کی کوئی مضبوط شہادت نہیں ملتی کیونکہ ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ طبقہ اولیٰ کی کتب احادیث میں ظہور مہدی سے متعلق ایک روایت بھی موجود نہیں ہے۔ نہ امام بخاری نے ان روایتوں کو قبول کیاہے، نہ امام مسلم نے، نہ امام مالک نے۔ دوسری طرف ان روایتوں میں بھی جنہیں بعد کے ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں نقل کیاہے۔ شاید ہی کوئی روایت ایسی ہو گی جو محدثانہ معیار تحقیق پر بالکل بے داغ ثابت ہوتی ہو اور اس کا کوئی نہ کوئی راوی شیعہ یاشیعیت سے متاثر نہ نکلتا ہو۔ ان وجوہ سے بعض علماء نے تو ظہور مہدی کی پیش گوئی یابشارت کو تسلیم کرنے ہی سے انکار کر دیاہے اگرچہ یہ رائے ایک محتاط رائے نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن اس میں کوئی بھی شک نہیں کہ معاملہ، جس اہمیت کاہے اس کے پیش نظر اس کی روایت زیادہ مضبوط سندوں سے ہونی چاہیے تھی اور اگر ایسا نہیں ہوا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو خود نبی ﷺ کے نزدیک اس معاملہ کی کوئی خاص دینی اہمیت تھی نہ آپ کی ہدایتوں اور آپ کے علوم وارشادات کو باقی امت تک منتقل کرنے والے صحابہؓ کے نزدیک۔

لیکن ان تمام باتوں سے اگر صرف نظر کر لیاجائے تو سوال یہ ہے کہ اس خبر کا ان ذمے داریوں سے آخر تعلق کیاہے جو اہل اسلام پر اقامت دین کے ضمن میں عائد ہوتی ہیں ؟اس سے جو کچھ ثابت ہوتاہے وہ صرف اتناہی تو ہے کہ اس دنیا کا نظام فنا ہونے سے پہلے ایک مبارک دور آئے گا۔ دنیاعدل سے بھر جائے گی اور حضرت ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کی طرح "خلافت علیٰ منہاج النبوت" سارے عالم میں قائم ہو جائے گی۔ اس سے یہ کسی طرح لازم آگیا کہ بیچ کے زمانوں کے لیے ساری دنیا پر کفر اور طاغوت کی فرمانروائی مقدر ہو چکی ہے اس پیش گوئی میں تو کوئی دور کا بھی اشارہ اس امر کا موجود نہیں ہے کہ ابتدائے اسلام کی تیس سالہ خلافت راشدہ کے اختیام سے لے کر ظہور مہدی تک زمین کے کسی خطے پر بھی اللہ کا دین قائم نہ ہو گا۔ بخلاف اس کے تاریخ گواہ ہے کہ اس دور سعید کے ختم ہونے کے ستر برس بعد ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھوں مملکت اسلام میں قریب قریب ویسی ہی بہار سعادت پھر آگئی جو اس دور میں تھی اور اس زمانے کو بھی خلافت راشدہ کا زمانہ تسلیم کیا گیاہے اس کے علاوہ جس پایہ کی ظہور مہدی والی یہ روایات ہیں۔ قریب قریب اسی پایہ کی کچھ دوسری روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن میں مہدی موعود کے علاوہ اور ان سے پہلے اقامت دین کی کچھ اور تحریکوں کے اٹھنے کی پیشنگوئیاں کی گئی ہیں اور مسلمانوں پر ان کی حمایت واجب قرار دی گئی ہے مثال کے طور پر دوراویتیں ملاحظہ ہوں:

ا۔ **اذا راتیم الایات السود قد جاءت من قبل خراسان فاتوا ھا ولو حبوا علی الثلج فیھا خلیفتہ اللہ مھدی**

جب تم دیکھنا کہ خراسان کی طرف سے کالے جھنڈے آرہے ہیں تو وہاں پہنچنا اگرچہ تمہیں برف کے اوپر گھسٹ کر ہی کیوں نہ جانا پڑے اس لیے کہ ان کے اندر اللہ کا ہدایت یافتہ خلیفہ ہوگا۔

۲۔ **يخرج رجل من وراء النهر يقال له الحارث حراث على مقلعته رجل يقال له منصور يواطى اويمكن لال محمد كما مكنت قريش لرسول اللهﷺ وجب على كل مسلم نصره او قال اجابته،** (ابو داؤد: جلد دوم)

ماوراء النہر سے "حارث حراث نامی ایک ایک شخص نکلے گا جس کے آگے (یعنی جس کا سپہ سالار) منصور نامی ایک آدمی ہوگا۔ وہ آل محمد ﷺ کے لیے قوت اور اقتدار پیدا کرے گا۔ جس طرح کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کے لیے کیا تھا۔ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اس کی مدد کرے یا یوں فرمایا کہ اس کی پکار پر لبیک کہے۔

یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ ان روایتوں میں جن اشخاص کے ظہور کی خبر دی گئی ہے ان سب سے مراد ایک ہی شخص، یعنی وہی "مہدی موعود" ہیں۔ کیونکہ مہدی موعود کا ظہور جیسا کہ روایات کا بیان ہے، مدینہ منورہ سے ہوگا نہ کہ ماوراء النہر یا خراسان سے۔ اسی طرح ان کا نام آنحضرت ﷺ کے نام پر ہوگا (نہ کہ حارث حراثؓ نیز یہ کہ وہ اہل عرب کے جلو میں نکلیں گے، نہ کہ خراسانی یا تورانی افواج کو لے کر۔ پھر یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیے کہ ان روایت میں حصر ہو گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ان میں ان تمام داعیان حق کی فہرست گنا دی ہے جو قیامت تک اقامت دین کا علم لے کر اٹھنے والے ہیں۔ اس کے بخلاف ان روایتوں میں صرف بعض افراد اور چند زمانوں کا ذکر کیا گیا ہے اور مقصود اس امر کی تاکید ہے کہ جب کبھی بھی ایسے مواقع پیش آئیں تو ہر مسلمان کا فرض ہوگا کہ اقامت حق کی اس مہم سے اپنے کو وابستہ کر دے۔

غرض ان روایات میں نہ صرف یہ کہ مہدی موعود کے ماسوا حق کے کچھ علمبرداروں کی آمد کی بشارت سنائی گئی ہے بلکہ ہر مسلمان پر واجب گردانا گیا ہے کہ سر کے بل چل کر ان کے پاس پہنچے اور ان کی اعانت واطاعت میں جان کی بازی لگا دے کیا یہ بات اس بے بنیادی تخیل کا کھوکھلا پن واضح نہیں کرتی کہ اب مہدی موعود کے آنے سے پہلے قیام دین کی جدوجہد سے امت فارغ البال قرار پا چکی ہے؟

پھر اس مسئلہ پر اصولی حیثیت سے بھی غور کیجیے اور دیکھیے کہ ایک بنیادی فریضے کی خود اپنی نوعیت کیا چاہتی ہے؟ جب یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اقامت دین ہی ہر مسلمان کی زندگی کا تنہا مقصد ہے۔ جب اس فریضے کی خاطر جدوجہد کرنا ہی اس کے ایمان کی کسوٹی ہے جب مومن کا اصل مزاج ہی یہ بنایا گیا ہے کہ باطل اور منکر سے ابدی بیر ہے اور اسے وہ دنیا کے کسی گوشے میں بھی موجود دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اتباع قرآن کے عہد کا سب سے آخری مطالبہ ہی یہ ہے کہ مسلمان کی سعی وجہد اس وقت تک نہ رکنی چاہیے جب تک کہ دین حق کی کوئی ایک دفعہ بھی معطل ہو، یا زمین کا کوئی ایک ذرہ بھی باطل کے پاؤں تلے دبا پڑا ہو۔ تو ہر مومن کو اپنے طور پر یہ جدوجہد لازماً کرنی ہی پڑے گی۔ اور ہر حال میں، ہر دور میں، ہر ماحول میں اور ہر جگہ کرنی پڑے گی۔ امام مہدی جب آئیں گے تو وہ فرض اپنا ادا کریں گے نہ کہ میرا اور آپ کا۔ ان کی تمام دوڑ دھوپ صرف اپنے اس بوجھ کو اتارنے کے لیے ہوگی جو اللہ رب العالمین کی طرف سے خود ان پر ڈالا گیا ہوگا۔ کسی دوسرے کا بوجھ وہ اپنے سر نہ لیں گے نہ لے سکیں گے۔ اس لیے ان کی سعی وجدوجہد کسی بھی دوسرے مدعی اسلام کے ادائے فرض کی قائم مقام نہ ہوگی۔ جس طرح وہ کسی کی طرف سے نہ تو نماز پڑھیں گے، نہ روزے رکھیں گے۔ اسی طرح وہ کسی کی طرف سے اقامت دین کی جدوجہد بھی نہ کریں گے۔ آپ نے آج ہی سے ان کی جدوجہد پر تکیہ کر کے بیٹھ گئے ہیں جب کہ ان کا وجود عالم تصور اور دنیائے آرزو سے باہر بھی نہیں آیا ہے مگر یقین کیجیے کہ وہ اس وقت کے بھی کسی مسلمان کی طرف سے کوئی دینی فریضہ ادا نہ کریں گے۔ جو ان کے اپنے زمانے میں موجود ہوگا۔ اس وقت بھی ہر مسلمان کو اپنا فرض ٹھیک اسی طرح خود ہی ادا کرنا ہوگا جس طرح کہ امام موصوف کو اپنا فرض۔ یعنی حضرت مسیحؑ کے لفظوں میں ہر "شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانی ہوگی۔" اور جو ایسا نہ کرے گا "آسمانی بادشاہت" میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہر مسلمان کو یہ دعا یہ آرزو تو ضرور کرنی چاہیے کہ اس کو

کوئی ایسا دور سعادت دیکھنا نصیب ہو۔ جس میں ظلم وفساد کے بوجھ سے کراہتی ہوئی دنیا امن اور انصاف کی رحمتوں سے باغ و بہار بن جائے۔ مگر کسی ایک لمحہ کے لیے بھی خوش فہمی کا یہ فریب نہ کھانا چاہیے کہ کسی نے آنے والے مرد کامل کے صدقے میں اب سارے مسلمان بندگی کی بنیادی ذمے داری.................. اقامت دین کی جدوجہد........................ سے سبکدوش کر دیئے گئے ہیں ورنہ یہ کچھ ویسا ہی ہوگا جیسا کہ عیسائی حضرات نے گمان کر رکھا تھا کہ مسیح نے سولی پر چڑھ کر ہم سے عمل کی ذمے داریاں ساقط کرا دی ہیں۔

احتساب نفس کی ضرورت

اقامت دین کی جدوجہد سے دامن بچانے کے حق میں جو مختلف "فلسفے" پیش کیے جاتے ہیں، اوپر کی مفصل معروضات میں ان کا اور ان کے استدلال وزن کا حال آپ نے دیکھ لیا۔ اگر ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور گروہی، سیاسی اور تقلیدی تعصبات سے بالاتر ہو کر خالص حق پسندانہ نقطہ نظر سے اپنے افکار و اعمال کا جائزہ لیا جائے تو توقع ہے کہ وہ تاریکیاں ضرور چھٹ جائیں گی۔ جو غفلت اور کج فکری کی بدولت نہ جانے کب سے ہمارے ذہنوں پر چھائی چلی آ رہی ہیں۔ اور جنہوں نے ہمارے مقصد وجود کو ہماری نگاہوں سے اوجھل بنا رکھا ہے مگر بھولنا نہ چاہیے کہ نفس اپنا احتساب کرنے میں سخت حیلہ گر اور فریب کار واقع ہوا ہے۔ اس پر کسی غیر مانوس اور نافرعوب حقیقت کا سامنا کرنا بڑا ہی شاق ہوتا ہے اور اس حقیقت کے خلافت تو وہ اپنے ترکش دجل کا آخری تیر تک استعمال کر ڈالتا ہے جو اس سے قربانیوں کی طلب گار ہو۔ صرف جان اور مال ہی کی قربانیوں کی نہیں بلکہ جذبات و میلانات کی قربانیوں کی بھی۔ پندار علم و فہم کی قربانیوں کی بھی، سابق طرز عمل کی محبت اور عصبیت کی بھی کہ بسا اوقات ان چیزوں کی قربانیاں جان و مال کی قربانیوں سے بھی زیادہ دشوار ہوتی ہیں۔ ادھر سے نور حق کی تجلی دکھائی دیتی ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ سمت قبلہ یہی ہے اور ادھر نفس کے حیلے اور وسوسے اٹھتے ہیں اور انسان سے پوچھتے ہیں کہ کیا اب تک کی تیری ساری دوڑ دوپ باطل کی راہ میں تھی؟ کیا زمانے کے شیوخ واکابر اور وقت کے ارباب علم ودانش جن راہوں پر چل رہے ہیں۔ وہ سب کے سب ترکستان ہی کی طرف جاتی ہیں؟ یہ سوالات نفسیاتی حربوں سے ایسے مسلح ہوتے ہیں کہ انسان ان کا شکار ہو جانے سے بہت کم بچتا ہے اور انجام کار ایک چیز کو حق سمجھنے کے باوجود اسے حق تسلیم نہیں کرتا۔ یہ نفس انسانی کی وہی جبلی کمزوری ہے جو ہمیشہ سے اطاعت کے جواب میں بدبخت انسانوں کی زبان سے یہ آواز بلند کراتی رہی ہے کہ:

بل نتبع ما الفينا عليه اباءنا (بقرہ: ۱۷۰)

"بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔"

اس لیے اگر راہ حق وصواب کی سچی طلب ہو تو ضروری ہے کہ نفس کی اس مہلک کمزوری اور دسیسہ کاری سے انسان پوری طرح چوکنا رہے اور اس عظیم اصول کو ہرگز نہ بھولے کہ حق و باطل کا معیار نہ تو کوئی شخص ہے........................ بجز ایک شخص کے جس کا نام محمد (ﷺ) ہے اور نہ کوئی جماعت ہے.................. سوالے ایک جماعت کے، جس کو دنیا اصحاب محمد ﷺ کے نام سے پکارتی ہے ورنہ وہ اپنے فکر و عمل کا بے لاگ احتساب کر ہی نہیں سکتا اور جب تک یہ توفیق میسر نہ ہو ہدایت یابی کی توقع ہی فضول ہے۔ اس لیے مسئلہ زیر بحث کے سلسلے میں صرف اللہ کی کتاب اس کے رسول ﷺ کی سنت اور اصحاب رسول ﷺ کا اسوہ ہی ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔ اگر حق اور ہدایت کے ان سرچشموں میں ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں بتایا گیا ہے کہ اس کا ہر سانس اقامت دین کے ذکر و فکر اور سعی وجہد میں بسر ہونا چاہیے تو پھر اس کام کے لیے اپنے کو وقف کر دیجیے اور ہر چیز کو ٹھکرا دیجیے، جو اس عزم کی مزاحمت کرے۔ خواہ وہ کسی پیر و مرشد کی ارادت ہو یا کسی شخص وامام کی عقیدت، کوئی جماعتی رشتہ ہو یا اب تک کا طرز فکر و عمل۔ یہ چیزیں اگر اس صراط مستقیم پر قدم بڑھانے سے روکتی ہیں تو باور کیجیے کہ یہ سب نفس

کے حجابات اور شیطان کے فتنے ہیں اور قدرت نے ان کو انسان کے لیے صرف اس مقصد سے پیدا کر رکھا ہے تا کہ اس کی حق پرستی کی آزمائش ہو۔ مبارک ہے وہ بندہ جو ان حجابوں کو چاک کر کے اور ان فتنوں کو کچل کر اپنے فرض کی پکار پر حرکت میں آجائے ورنہ یاد رہے کہ کوئی عقیدت، کوئی ارادت، کوئی رشتہ اور کوئی تاویل بھی ہم کو خدا کی گرفت سے نہیں بچا سکتی۔ جب تک راز حق دل پر نہ کھلا ہو اس وقت تک تو انسان کسی حد تک معذور مانا بھی جا سکتا ہے مگر جب حقیقت بے حجاب نظر آگئی اور دل نے اس کی صداقت کا اعتراف کر لیا تو سمجھ لیجیے کہ اللہ کی حجت تمام ہو گئی اور اعتذار کے سارے دروازے بند ہو گئے۔ اب آگے یا تو آمادگی عمل اور کامرانی حیات ہے، یا پھر فرض کا انکار اور نامرادی کا عذاب کیونکہ حق کو حق سمجھ لینے کے بعد اس سے منہ موڑنا اس سنت فرعونی کی پیروی کرنا ہے جس کا تذکرہ قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے:۔

فلما جآءتهم ایتنا مبصرۃً قالوا ھذا سحر مبین وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم ظلماً وعلوا (نمل: ۱۳، ۱۴)

"جب ان کے سامنے ہماری واضح نشانیاں آئیں تو انہوں نے کہا یہ صاف جادو ہے اور باوجود اس کے کہ ان کے دل ان نشانیوں کی حقانیت پر یقین رکھتے تھے انہوں نے ظلم و سرکشی کی بنا پر ان کا انکار کر دیا۔"

اور اس سنت کی پیروی کا جو انجام ہو سکتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ بلاشبہ بڑی کٹھن راہ ہے اور اس کا ہر قدم کانٹوں سے بھرا ہوا ہے مگر رضائے الٰہی کی منزل تک پہنچانے والی اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔ اس لیے اگر دنیا کے برباد اور آخرت کو کو تباہ نہ کرنا ہو تو اسے اختیار ہی کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر کسی کے تلوے زن کانٹوں کا خیر مقدم کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تو اس کے لیے آخری چارہ کار جس کو برداشت کیا جا سکتا ہے صرف یہ ہے کہ وہ جہاں ہے وہیں قدم روکے کھڑا رہے اور اگر کوئی پوچھنے والا اس سے پوچھے تو اسے ضرور بتادے کہ اگرچہ مجھے اس پر چلنے کی علمی توفیق حاصل نہیں، مگر حق و نجات کی شاہراہ یہی ہے یہ اس لیے تا کہ کل اللہ تعالیٰ کے حضور ترک فرض کے ساتھ کتمان حق کے جرم میں بھی نہ پکڑا جائے اور اگر بدقسمتی سے اس میں اتنی جرات بھی نہ ہو تو پھر اپنے قدموں کی طرح اپنی زبان کو بھی روکے رہے اور کسی حال میں بھی دوسروں کو اس راہ سے روکنے کا وبال اپنی گردن پر نہ لے۔ کیونکہ یہ رویہ کھلا ہوا "صد عن سبیل اللہ" اور صد عن سبیل اللہ ایک ایسی لعنت ہے جس کے تصور ہی سے ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جانے چاہیں۔

اس موقع پر اس بحث میں جانا فضول ہے کہ آج امت مسلمہ کا کوئی فرد یا گروہ اس بدبختی میں مبتلا ہے یا نہیں؟ کیونکہ یہ صورت حال اگر آج موجود نہیں ہے تو کل موجود ہو سکتی ہے۔ یہ اندیشہ پیش روامت کے اس عملی ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے قطعاً بے بنیاد نہیں جس کی عکاسی حضرت مسیح علیہ السلام اپنی اس طرح کی تنقیدوں میں فرما گئے ہیں۔

"اے ریاکار فقیہو! اور فریسیو! پر افسوس! کہ آسمان کی بادشاہی لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔" (متی باب ۲۳)

ویسے دعا یہی ہے کہ خدا وہ دن کبھی نہ لائے جب کوئی مسلمان حق دشمنی کی اس لعنت میں مبتلا نظر آئے۔

پانچواں باب

اقامت دین کا طریق کار

مقصد سے اصول کار کا فطری ربط

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ ہماری زندگی کا عملی نصب العین دین حق کی اقامت ہی ہے اور کوئی تاویل یا عذر اس کی ذمے داری سے ہمیں کبھی سبکدوش نہیں کر سکتا، تو اب پوری سنجیدگی اور اہمیت سے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس نصب العین کے لیے جدوجہد کس طرح کی جائے؟ آیا اس کا کوئی مخصوص طریق کار ہے یا جس سمت سے چاہیں اس منزل مقصود کی طرف مارچ کر سکتے ہیں؟ جن لوگوں نے اجتماعیات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہو گا وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ ہر جماعت کا جو کسی مقصد کو لے کر اٹھی ہو، جس طرح ایک مخصوص مزاج اور ایک مخصوص انداز فکر ہوتا ہے اسی طرح اس کی تشکیل، تنظیم اور تعمیر کا بھی ایک مخصوص انداز ہوتا ہے اس انداز فکر کی طرح اس انداز تعمیر کا تعین بھی وہی مقصد کرتا ہے جس کو لے کر یہ جماعت اٹھی ہوتی ہے۔

اس اصولی حقیقت کو چند مثالوں سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

فرض کیجیے کہ آپ کو ایک قومی حکومت قائم کرنا ہے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو جو کچھ کرنا ہو گا وہ یہ ہو گا کہ آپ پہلے تو اپنے افراد قوم کے دلوں کو وطنی سربلندی اور قومی اقتدار کے عشق سے معمور کریں۔ ان میں اپنے اوپر آپ حکمراں ہونے کا عقیدہ اور عزم پیدا کریں، پھر قومی آن پر نثار ہو جانے کے لیے ان کے اندر سرفروشی کی آگ بھڑکائیں اور اپنے محبوب مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان کی قوتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیں۔ جب یہ سب آپ کر لیں تو بس سمجھ لیجیے کہ کامیابی کی تمام شرطیں آپ نے پوری کر لیں۔ اب آپ کو یہ دیکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ میرے جھنڈے کے نیچے جو لوگ جمع ہیں وہ توحید کے متعلق، رسالت کے متعلق قیامت کے متعلق اور جزائے عمل کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں؟ ان کے اندر دین کی پابندی کتنی ہے؟ انہوں نے سچائی، رحمدلی، پاک دامنی، خوش خلقی اور خدا ترسی جیسے اوصاف سے اپنے کو کہاں آراستہ کر لیا ہے؟ ان میں سے کسی چیز کے بھی دیکھنے کی آپ کو حاجت نہیں، کیونکہ جو مقصد اور نصب العین آپ کے سامنے ہے اس کے لیے یہ چیزیں سرے سے مطلوب ہی نہیں ہیں بلکہ شاید کچھ مضر ہی ہوں۔ یہاں تو جو چیزیں مطلوب ہیں وہ صرف یہ ہیں کہ حریف طاقتوں سے اندھی دشمنی اور قوم سے اندھی محبت رکھیے اور اس دشمنی اور محبت میں سب کچھ کر گزریے۔

اسی طرح اگر آپ ملک میں کمیونزم کا اقتدار اور کمیونسٹ نظام قائم کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو پہلے وہاں کے باشندوں کے ذہن میں کمیونسٹ فلسفہ زندگی کمیونسٹ نظام معیشت و حکومت اور کمیونسٹ نظریہ اخلاق کی "خوبیاں" اتارنی ہوں گی۔ سرمایہ پرستی ہی نہیں بلکہ سرمایہ داری کے بھی خلاف دلوں میں شدید نفرت پیدا کرنی ہو گی۔ مارکس اور لینن کے ساتھ وہ عقیدت پیدا کرنی ہو گی جو خدا اور پیغمبر کے لیے اہل مذہب کے دلوں میں ہوا کرتی ہے۔ اور خدا، رسول ﷺ، آخرت، دین، اخلاق اور اعمال صالحہ کے الفاظ کو خود غرض سرمایہ پرستوں کے ہتھکنڈے قرار دے کر اور ان کے اثر کو ذہنوں سے مٹا کر خالص مادی تصور حیات اور حیوانی کائنات ان پر ثبت کرنا ہو گا۔ پھر جب آپ یہ بنیاد جما لیں اور ایک بڑی تعداد میں لوگوں کو ان خیالات اور نظریات کا گرویدہ بنا لیں تو ان کا ایک حصہ بنا کر ایک طرف باقی قوم کو اپنے پروپیگنڈے کے زور پر مسحور کرنے کی جدوجہد

جاری رکھیں اور دوسری طرف خفیہ اور علانیہ تمام ممکن ذرائع سے موجودہ نظام حکومت کے تخت کو الٹنے کی مہم شروع کر دیں۔ تاآنکہ عوام کے ہاتھوں یہ تخت الٹ کر اشتراکی حکومت قائم ہو جائے۔

علیٰ ہذالقیاس اگر ایک منظم طریقے پر رہزنی کرنا چاہتا ہو تو وہ ایسے لوگوں کو تلاش کرے گا جو مضبوط جسم، بے خوف دل اور خونخوار فطرت رکھتے ہوں۔ ایسے آدمی اس کے کسی کام کے نہ ہوں گے جو نرم دل ہوں اور غارت گری وخون ریزی سے متنفر ہوں۔ جب ایسے لوگوں کو وہ حاصل کرلے گا تو ان "ضروری اور کارآمد" صفتوں کا ان میں مزید استحکام پیدا کرنے کی تدبیریں کرے گا۔ لوٹ مار کے انہیں گر سکھائے گا اسلحے مہیا کرے گا تب کہیں جا کر اپنی مہم کا آغاز کر سکے گا۔

غرض دنیا کی ہر مقصد جماعت کا یہی حال ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے جو اس کے پیش نظر مقصد سے فطری لگاؤ رکھتے ہوں اور لازماً ایسے ہی طریق کار اور ایسی ہی پالیسیاں اختیار کرتی ہے جو اس مقصد کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ "امت مسلمہ" کہلانے والی جماعت اور قیام دین کا مقصد بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بھی ایک خاص طریق کار ہونا چاہیے آیئے دیکھیں وہ طریق کار کیا ہے؟

طریق کار کے ماخذ

اس غرض کے لیے ہماری نگاہ اٹھتی ہے تو قدرتاً وہ قرآن اور سنت ہی پر جا کر ٹھیرتی ہے کیونکہ جہاں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقامت دین ہمارا فریضَہ حیات ہے۔ حق یہ ہے کہ اس فریضے کو ادا کرنے کے اصول کار بھی وہی سے ملیں۔ کیا قرآن اور سنت نے ہماری اس ضرورت کو محسوس کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہر حیثیت سے مکمل اثبات میں ہے۔ اسلام سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والا بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ قرآن اور صاحب قرآن نے جس طرح امت مسلمہ کا مقصد وجود بالکل وضاحت سے بیان کر دیا ہے اسی طرح اس کے طریق کار کے بارے میں بھی انہوں نے کوئی حجاب باقی نہیں رہنے دیا ہے۔ چنانچہ ہر اس آنکھ کو جو اندھی نہ ہو، قرآن اور سنت کے صفحوں میں یہ طریق کار اسی طرح نمایاں اور روشن دکھائی دے سکتا ہے جس طرح اندھیری راتوں میں آسمان کے سینے پر جگمگاتی کہکشاں، قرآن، قرآن کے طریق نزول اور صاحب قرآن کے اسوہ، تینوں سے طریق کار کی کھلی کھلی نشاندہی ہوتی ہے۔ جو کہنے میں تو تین الگ الگ وجود ہیں مگر زیر بحث مقصد کے اعتبار سے تینوں دراصل ایک ہی ہیں۔ قرآن کے نصوص کو چونکہ اس معاملہ میں بنیاد کی حیثیت حاصل ہے اور باقی دو چیزیں اسی کے توابع اور لوازم کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس لیے اقامت دین کے اصول وطریق کار کی بنیادی وضاحت بھی ہمیں اسی سے لینی چاہیے۔

اقامت دین کے قرآنی اصول

قرآن حکیم کو غور سے پڑھیے تو وہ اصول و نکات بڑی آسانی کے ساتھ ساتھ آجاتے ہیں جن کے مطابق اقامت دین کی جدوجہد کی جانی چاہیے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان اصولوں کی تفصیل سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو توقع کے عین مطابق ہے کیونکہ جب اس کے مباحث کا اصل مرکز ہی یہی اقامت دین ہے تو قدرتی طور پر اس کی ساری تفصیلات بلاواسطہ یا بالواسطہ اسی کے اصول وذرائع کی شرح وتفصیل ہی ہوں گی۔ لیکن چونکہ قرآن اپنے مدعا کو انسانی ذہن میں پوری طرح بٹھا دینے اور اچھی طرح محفوظ کر دینے کے لیے کوئی ضروری تدابیر اٹھا نہیں رکھتا اور جہاں تک اقامت دین کے مسئلے کا تعلق ہے وہ تو اس کا سب سے اہم بنیادی مسئلہ تھا۔ اس لیے اس کے اصول و طریق کار کو اس نے جہاں

سینکڑوں صفحات میں پھیلا کر بیان کیا ہے۔اور مختلف جگہوں میں اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہاں بعض مقامات پر اس نے انہیں اکٹھے سمیٹ کر بھی بیان کیا ہے تا کہ چند جملوں کے مختصر سے آئینے میں ان پوری تصور یک نظر بھی دیکھی جا سکے۔اس طرح کے "جوامع الکلم" میں سب سے زیادہ جامع اور ساتھ ہی سب سے زیادہ واضح آیتیں یہ ہیں:۔

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ و لا تموتن الا و انتم مسلمون واعتصوا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا و اذکروا نعمتہ اللہ علیکم اذ کنتم اعدآء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا".......................... **ولتکن من کم امتہ یدعون الی الخیر و یأمرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولٓئک ھم المفلحون و لا تکونوا کالذین تفرقوا و اختلفوا من بعد ما جآء ھم البینات**(آل عمران:۱۰۲،۱۰۵)

"اے ایمان والو! اللہ کا ٹھیک ٹھیک تقویٰ اختیار کرو اور دنیا سے نہ رخصت ہو مگر اس حال میں کہ تم "مسلم" ہو اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑلو اور ٹولی ٹولی نہ ہو جاؤ۔اللہ کے اس احسان کو یادرکھو جو تم پر ہوا ہے جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دل باہم جوڑ دیئے۔اور اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی ہو گئے......................... اور چاہیے کہ تم وہ گروہ بنو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکتا رہے،ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور (دیکھو) کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح ہدایتیں پانے کے باوجود ٹولیوں میں بٹ گئے اور اختلاف میں مبتلا ہو گئے۔

یہ آیتیں مدینہ کی زندگی،یعنی ۳ھ میں نازل ہوئی تھیں۔یہ وہ زمانہ ہے جب امت مسلمہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی تاسیس و تعمیر کے ابتدائی مرحلوں سے گزر رہی تھی۔عین اس زمانے میں یہ آیت کریمہ اللہ تعالی کی طرف سے اقامت دین اور نظام مومنین کا ایک مختصر مگر جامع ربانی پروگرام لے کر آئیں۔جس میں اقامت دین کے طریق کار کے نہ صرف عملی اصول ہی بتا دیئے گئے ہیں بلکہ یہ بھی واضح فرما دیا گیا ہے کہ ان اصولوں میں باہم ترتیب کار کیا ہونی چاہیے؟ نیز یہ بات بھی کہ اس کے اس نصب العین کی خاطر کی جانے والی جدوجہد کن تدریجی مرحلوں سے گذرتی ہوئی اپنی غایت مقصود تک پہنچا کرتی ہے اس ربانی پروگرام پر غور کیجیے تو وہ تین اجزاء یا اصولی نکات پر مشتمل دکھائی دے گا:۔

ا۔تقویٰ کا التزام ۲۔مضبوط و منظم اجتماعیت ۳۔امر بالمعروف و نہی عن المنکر یہی تین نکات ہیں جو اقامت دین کے بنیادی اصول کار ہیں۔ان کو تفصیل کی روشنی میں دیکھیے۔

ا۔تقویٰ کا التزام

اقامت دین کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے اور جس کو اس راہ کی "شرط اول قدم" کہنا چاہیے۔وہ **اتقوااللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا و انتم مسلمون**......................... کے فرمان خداوندی میں مذکور ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے کو "ایمان والا" سمجھتا ہو،اور جو اس ایمان کی عائد کی ہوئی ذمے داری سے عہدہ برآہونا چاہتا ہو۔اس کے لیے لازم ہے کہ اللہ کا "تقویٰ" اختیار کرے اور اپنے آخری سانس تک ہر آن اور ہر لحہ ایک "مسلم" بن کر زندگی بسر کرے۔"تقویٰ" کا پورا عملی مفہوم جو قرآن کی زبان سے بیان ہوا ہے اس سے شمہ برابر بھی کم نہیں کہ اللہ کے تمام حکموں کا ٹھیک ٹھیک اتباع کیا جائے۔اس کے کسی امر کو چھوڑ دینے سے بھی ڈرا جائے اور اس کے کسی نہی کے کر گزرنے سے بھی خوف کھایا جائے۔اسی طرح "مسلم" کے معنی بھی قرآنی بیانات کی روشنی میں سچے فرماں بردار اور مخلص اطاعت شعار کے ہیں یعنی مسلم وہ شخص ہے جس نے احکام خداوندی کے سامنے اپنی گردن رضا کارانہ جھکا دی ہو۔اس لیے ان دونوں اصطلاحوں کے مفہوموں کے پیش نظر اقامت دین کے

پروگرام کا پہلا جزو، یا اصول یہ ہوا کہ ہر مسلمان سب سے پہلے خود اپنے اوپر اللہ کے دین کو قائم کرے۔ خوف ورجا کی ساری نیاز مندیاں بس اسی ایک ذات کے لیے مخصوص کردے۔ تعظیم وتذلل اور سرنگندی کے تمام جذبات اسی کی رضاجوئی کے لیے وقف کردے۔ تمام اطاعتوں سے منہ موڑ کر بس اسی ایک آقا کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لے۔ اپنے نفس کو ان تمام امور سے پاک کرے جو اس کی ناخوشی کا سبب بنتے ہیں۔ اور ان تمام صفات سے اسے آراستہ کرے جو اس کی رضا کا باعث ہوتے ہیں۔ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا ہمہ وقتی نظام سمجھتا رہے اور اس کے کسی حکم کی بجاآوری میں نہ تولیت و لعل کرے نہ دل تنگ ہو۔ اپنی نگاہ کو حق تعالیٰ کی رضا طلبی اور حکم برداری پر پوری طرح جمائے رہے۔ خواہ کتنی ہی مخالفتیں، مصیبتیں ناسازگاریاں اور دل شکنیاں اس کی راہ میں کیوں نہ حائل ہوں۔ کیونکہ یہ چیزیں اگرچہ بظاہر مشکلات و مصائب ہی ہیں مگر فی الواقع یہ اتباع حق اور التزام تقویٰ کی ضروری آزمائش منزلیں ہیں جن سے گزرے بغیر کسی مدعی ایمان کا ایمان اور تقویٰ خدا کے ہاں سند اعتبار اور شرف قبول نہیں حاصل ہوتا جیسا کہ قرآن کا فرمانا ہے:۔

ولنبلونکم بشیء من الخوف و الجوع ونقص من الاموال و الانفس و الثمرات و بشر الصابرین الخ (بقرہ:۱۵۵)

''ہم تم کو (یعنی تمہارے ادعائے ایمان کو) خطروں اور فاقوں اور تمہارے مال اور جان اور پیداوار کے نقصانوں کے ذریعہ ضرور آزمائیں گے اور اے نبی ﷺ ان لوگوں کو (کامرانی کا) مژدہ سنادو جو (ان خطرات و نقصانات کو) صبر وضبط کے ساتھ برداشت کرلیں، الخ''

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا و هم لا یفتنون و لقد فتنا الذین من قبلهم فلیعلمن الله الذین صدقوا و لیعلمن الکاذبین (عنکبوت:۱)

''کیا لوگوں نے یہ گمان کررکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انہیں پرکھا نہ جائے گا۔ حالانکہ (یہ پرکھنا ہماری ہمیشہ کی سنت ہے اور) ہم نے ان سے پہلے بھی لوگوں کو پرکھا ہے لہٰذا (تمہیں بھی) اللہ تعالیٰ یہ ضرور دیکھے گا کہ تم میں سے کون سچے (مومن) ہیں اور کون جھوٹے۔

اس لیے ان چیزوں سے گھبرانے اور کترانے کے بجائے ان کا صبر اور اطمینان کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے ورنہ وہ دل ایمان کا لذت شناس نہیں ہو سکتا۔ جو ان رکاوٹوں کے آگے سپر ڈال دے۔ اور نہ وہ سینہ تقویٰ کے نور سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے جو اس آزمائش کی ہمت نہ رکھتا ہو۔ اپنے ایمان و اسلام کے متعلق بڑے دھوکے میں ہوگا۔ وہ شخص جو حدود اللہ کی پاسداری اور احکام قرآنی کی پیروی میں اپنے نام نہاد جانی اور مالی، گروہی اور طبقاتی، قومی اور وطنی مفادات کا بچاؤ پہلے کرلینے کی فکر کرے، اور اتباع حق کو جان ومال کی مامل محفوظیت کے ساتھ مشروط رکھتا ہو، ایسے شخص کی زبان پر اسلام، اور اس کی شکل وصورت پر تقویٰ تو ہو سکتا ہے مگر اس کا باطن ان طائران قدس کا آشیانہ نہیں ہو سکتا۔ غرض اہل ایمان کی آزمائش اللہ تعالیٰ کی ایک عام سنت ہے اور اسی سنت کو پورا کرنے کے لیے اس نے اسلام اور اتقاء کا راستہ مشکلات اور مصائب کی چٹانوں سے بھر رکھا ہے اور اس لیے جو شخص **اتقوا اللہ حق تقاته** .... کے فرمان الٰہی کی تعمیل کرنا چاہتا ہو اس کو ان چٹانوں سے ٹکرانا اور ان کی ٹھوکریں برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

۲۔ منظم اجتماعیت

اس پروگرام کی دوسری دفعہ یادوسرا نکتہ **وعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا** کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ان لفظوں میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے وہ دو باتوں پر مشتمل ہے ایک تو یہ کہ وہ تمام اہل ایمان، جو احکام الٰہی و حدود خداوندی کی پابندی میں سرگرم عمل اور اپنی انفرادی اصلاح و تزکیہ میں کوشاں ہوں۔ مل کر ایک مضبوط اور منظم جماعت بن جائیں اور یہ پوری جماعت ایک ہی جسم کے اعضاء کی طرح باہم جڑی ہوئی ہو۔ دوسری یہ کہ اسے اس طرح باہم جوڑ کر رکھنے والی چیز نہ تو کوئی نسلی رشتہ ہو نہ کوئی وطنی تعلق، نہ کوئی معاشی یا سیاسی مفاد ہو نہ کوئی دنیوی اور مادی مقصد بلکہ صرف "اللہ کی رسی" یعنی اس کی بندگی کا وہ عہد جو ہر مسلمان نے کر رکھا ہے۔ وہ قرآن ہو جس کی پیروی کسی شخص کو مومن بناتی ہے وہ دین ہو جس کی اطاعت و اقامت ہی کے لیے امت مسلمہ وجود میں لائی گئی ہے غرض جس طرح ملت کا منظم و متحد رہنا ایک ضروری چیز ہے اسی طرح یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس نظم و اتحاد کا شیرازہ صرف یہ "حبل اللہ" ہی ہو۔ بلکہ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو بات اس سے بھی کہیں زیادہ اہم نظر آئے گی۔ اتی زیادہ اہم کہ مجبوری کی بعض ایسی حالتیں تو ہو سکتی ہیں جن میں اتحاد و تنظیم و ملت سے محروم ہو کر بھی مومن خدا کے حضور معذوری اور بری قرار دیا جائے گا۔ مگر جو چیز اس اتحاد و تنظیم کا شیرازہ ہے اسے کسی حالت میں بھی اگر چھوڑ دیا گیا تو اس کی بازپرس سے چھٹکارا ہرگز نہ ہو سکے گا۔اس لیے یہ غلط فہمی نہ ہونے چاہیے کہ اسلام کے نزدیک نفس اتحاد ہی کوئی مطلوب و محبوب چیز ہے خواہ وہ کسی غرض کے لیے اور کسی مقصد پر مبنی کیوں نہ ہو۔اس کے بخلاف حقیقت یہ ہے کہ اگر اتحاد کی بنیاد کسی فاسد مقصد پر رکھی گئی ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کا مطلوب نہیں، بلکہ اس کی نظروں میں حد درجہ مردود اور مبغوض ہے اور اس اتحاد سے بال برابر بھی مختلف نہیں جو چوروں اور ڈاکوؤں کے مابین ہوا کرتا ہے، اسلام کا مطالبہ اس اتحاد کا ہے جس کا شیرازہ اتباع حق اور اقامت حق ہو۔

اقامت دین کا نکتہ، یعنی جماعتی اتحاد، اگر ذرا غور کیجیے تو پہلے نکتہ سے کوئی باطل الگ اور بے تعلق شے نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ایک طالب علم کو اس کی اپنی طبیعت ہی مجبور کرتی ہے کہ اپنے ساتھی طلباء سے بے تکلفی، دل بستگی اور الفت و محبت رکھے۔ایک تعلیم یافتہ اور علم دوست کے مذاق اور مزاج ہی کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ ارباب دانش کی ہم نشینی اختیار کرے۔ایک رنگین طبع اپنے جیسے رنگین مزاجوں کی طرف خود بخود کھنچ اٹھنے سے رک نہیں سکتا.................. اور اگر کسی طالب علم کو اپنے ساتھیوں سے، کسی صاحب علم کو اہل علم و فضل سے، کسی رنگین مزاج کو اہل نشاط سے گہری وابستگی نہ ہو تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ صحیح معنوں میں طالب اور صاحب علم اور رنگین طبع نہیں۔ ہم مشربی کی یہی وہ کشش ہے جس کو عام اصطلاح میں جاذبہ جنسیت کہا جاتا ہے۔اصولاً اس جاذبہ جنسیت کو اہل تقویٰ کے درمیان بھی اپنا کام کرنا چاہیے اور وہ کرتا بھی ہے۔ایک وہ انسان جو خدا پرستی کے جذبات سے سرشار ہو ان لوگوں کی طرف لازماً کھنچتا ہے جو اسی کی طرح اتباع حق اور تقویٰ کے لذت شناس ہوں۔ یہ ممکن نہیں کہ دو دلوں میں خدا کا حقیقی تقویٰ موجود ہو اور اس کے باوجود وہ آپس میں کٹے ہوئے یا ایک دوسرے سے بے تعلق ہوں۔اس کے بخلاف ان میں جذب و انجذاب لازمی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھا چاہیے کہ تقویٰ کی صورت میں اندر کوئی دوسری ہی روح پرورش پا رہی ہے کیونکہ ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کے دو مسافر ایک دوسرے کے غیر بن کر نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعریف اگر کہیں **۔انما المومنون اخوۃ** اور **بعضھم اولیاء** بعض کے الفاظ سے کی گئی ہے تو کہیں **رحماء بینھم** اور **اذلۃ علی المومنین** ان کا نشان امتیاز ٹھیرایا گیا ہے گویا اسلام کے پیروؤں کا باہم جڑ کر رہنا ان کے ایمان اور اتقا کی کسوٹی ہے۔قرآن کی نگاہ میں اہل ایمان کے لیے اس وصف کا وجود کتنی اہمیت رکھتا ہے

اس چیز کااندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بعض ہدایات پر بھی نظر ڈالی جائے جو اس معاملے کے منفی پہلو سے تعلق رکھتی ہے ان میں سے ایک ہدایت یہ ہے:۔

یا ایھا الذین امنوا لا تتخذوا اٰباء کم و اخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان و من یتولھم منکم فاؤلٓئك ھم الظالمون (توبہ: ۲۳)

"اے ایمان والو! اگر تمہارے باپ اور بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دیں تو ان کو اپنا ولی (قلبی رفیق) نہ بناؤ۔ اور جو لوگ ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی ظالم ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح ایک سچا مومن اور متقی دوسرے مومنوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتا خواہ نسلی اور قومی لحاظ سے وہ اس کے بیگانے ہی کیوں نہ ہوں اسی طرح وہ فساق وفجار سے قلبی رابطہ بھی نہیں رکھ سکتا۔ خواہ وہ اس کے قریب ترین عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن اس کے امکان کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ جیسا کہ اس ضمن کی ایک اور آیت صراحت کرتی ہے۔

لا یجد قوماً یومنون باللہ و الیوم الاخر یوادون من حاد اللہ و رسولہ و لو کانوا اباءھم او ابنآءھم او اخوانھم او عشیرتھم (مجادلہ: ۲۲)

تم کسی ایسے گروہ کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو ان لوگوں سے الفت و مودت کا رشتہ رکھتا ہوا نہ پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی عداوت اور مخالفت پر کمربستہ ہوں خواہ وہ اس کے اپنے ہی باپ یا بیٹے یا بھائی یا اہل خاندان کیوں نہ ہوں۔

ان ارشادات سے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ایمان کے رشتے کو انسانی تعلقات میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے وہ ایک طرف تو مختلف نسلوں اور قوموں کے افراد کو باہم بھائی بھائی بنا کر دیتا ہے۔ دوسری طرف اس کی زبردست قوت تمام مادی رشتوں کو بے جان اور غیر مؤثر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ گویا یہ ایک سورج ہے جس کے آگے تمام ستارے بے نور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر ایمان کا یہ منفی اثر و عمل اس کے مثبت اثر و عمل کو مزید طاقت بھی دے دیتا ہے اور اہل ایمان کے مابین قائم ہونے والے اتحاد کو زیادہ مستحکم بنا دیتا ہے۔

غرض ایک نصب العین کی علم بردار اور ایک اصول کی پیرو دوسری جماعتیں جس حد تک اپنے ارکان کو ڈسپلن کی مضبوط بندشوں میں باندھ کر رکھتی ہیں اللہ کا دین اپنے پیروؤں کو اس سے بھی زیادہ مضبوطی سے جڑ جانے کی زبردست ہدایت کرتا ہے۔ انتشار و اختلاف کو وہ انتہائی مذموم ٹھیراتا ہے اور دین حق کے مزاج کے سارے یکسر خلاف قرار دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک پیغمبر (حضرات ہارون علیہ السلام) نے اپنی قوم کی اکثریت کو علانیہ بت پرستی میں مبتلا ہو جاتے دیکھا مگر انہیں صرف سمجھانے بجھانے پر ہی اکتفا کیا اور ان کے خلاف کوئی فوری اقدام اٹھانے سے محض اس لیے احتراز کر گئے کہ کہیں قوم کی جمعیت پراگندہ نہ ہو جائے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سینا کہ پہاڑی سے واپس آکر ان سے اس سلسلے میں سختی سے باز پرس کی تو انہوں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل (میں اس بات سے ڈرا کہ آپ کہیں گے تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی)

۳۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اقامت دین کے پروگرام کی تیسری بنیاد ولتکن من کم امتہ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر کے ارشاد میں واضح کی گئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ انفرادی حیثیت سے اپنی اپنی ذات کے اوپر دین حق کو قائم کر لینا اور پھر ایسے تمام افراد کا باہم جڑ کر ایک جماعت بن جانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان دونوں باتوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس "خیر اور معروف" کی طرف دوسروں کو بھی بلایا جائے جس کو خود قبول

کیا گیا ہے اور اس "منکر" کو اپنے مقدور بھر مٹاڈالنے کی مسلسل کوشش جاری رکھی جائے جس کو خود ترک کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کی زمین کے کسی گوشہ میں اس کے دین کے سوا کسی اور دین کا اقتدار باقی نہ رہ جائے۔

جس طرح اقامت دین کے عملی پروگرام کی دوسری دفعہ (افراد امت کا منظم اتحاد پہلی دفعہ انفرادی صلاح و تقویٰ) کا لازمی تقاضا ہے اس طرح یہ تیسری دفعہ (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) بھی اس کا فطری مقتضا ہے نہ کہ کوئی ایسا مستقل بالذات حکم جو اس کے کسی طرح کی مزاجی مناسبت رکھتا ہی نہ ہو، یہ بات کہ امر بالمعروف کس طرح ایمان اور تقویٰ کی فطری طلب ہے ایمان و تقویٰ کی حقیقتوں پر غور کرنے سے باآسانی واضح ہو جاتی ہے۔ ایمان اور تقویٰ کی حقیقی روح کیا ہے؟ صرف اللہ تعالیٰ کی محبت بھری تعظیم، کوئی محبت بھری تعظیم محبوب کی مرضیات کے بارے میں کیا چاہے گی؟ صرف یہ کہ گردو پیش انہی کی کارفرمائی ہو۔ ورنہ اس دل کو سوز محبت سے آشنا کون کہہ سکتا ہے جو محبوب کی مرضی کو پامال ہوتا ہوا دیکھ کر تڑپ نہ اٹھے؟ اس لیے خدا کی محبت اور حق کی جاذبیت ایک خدا پرست کو چین سے ہرگز بیٹھنے نہیں دے سکتی۔ جب تک کہ صفحہ ارض پر اس کی نگاہوں میں چبھنے کے لیے ایک باطل اور کھلنے کے لیے ایک منکر بھی موجود ہو۔ یہ بات اس کے اسلام اور ایمان کے یکسر منافی ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا ملک کو وہ دین اللہ کے حلقہ انقیاد سے آزاد اور طاغوت کا فرمانبردار دیکھے۔ اور ٹھنڈے دل سے اسے برداشت کر لے۔ لہذا اقامت دین کا فریضہ ادا نہیں ہو سکتا، اگر پیروان اسلام کی جمعیت امر بالمعروف سے غافل ہو اور اتقوااللہ حق معا تعولا تموتن الا وانتم مسلمون کا حکم تشنہ تعمیل ہی رہ جائے گا۔ اگر اہل ایمان بس اپنی ذات ہی تک احکام الٰہی کی پیروی کو کافی سمجھ لیں اور ان کو اس سے کوئی غرض نہ ہو کہ باقی دنیا کدھر جا رہی ہے۔

اس کے علاوہ امر بالمعروف مومن اور مسلم اور متقی ہونے کے فطری تقاضوں میں ایک اور پہلو سے بھی داخل ہے اور وہ ہے اللہ کے بندوں سے اخوت، محبت اور خیر خواہی کا پہلو، جو شخص اسلام کو جانتا ہے وہ یہ بات بھی جانتا ہو گا کہ خدا سے محبت کرنے کا حق اس وقت تک ہرگز ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی مخلوق سے بھی محبت نہ رکھی جائے اس مخلوق سے جسے اس کے رسول ﷺ نے اس کی "عیال" کہا ہے۔ (الخلق عیال اللہ) اور جس کی بہی خواہی کو ایمان کی نشانی ٹھیرایا ہے (لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔ مسلم) نوع انسانی کے ساتھ بہی خواہی کی شکلیں بہت سی ہیں۔ مگر اس سے بڑی اس کی اور کوئی بہی خواہی نہیں کہ اسے ان راستوں سے بچایا جائے جو گمراہی اور ابدی ہلاکت کے راستے ہیں۔ اور جن پر چل کر انسان کی دنیا بھی عذاب بن جاتی ہے اور آخرت بھی۔ اس لیے ایک مومن اگر اپنے دوسرے ابنائے جنس کو "منکرات" سے روکنے اور خیر و معروف کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ دراصل کسی خارجی سبب کے تحت نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے اس جذبہ خیر خواہی کے تحت کرتا ہے جو اس کے ایمان کا پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح اس کا ایمان اسے اس بات پر ابھارتا رہتا ہے کہ بھوکوں کو کھانا کھلائے، ننگوں کو کپڑے پہنائے، اور کمزوروں اور بے کسوں کی مدد کرے، اسی طرح، مگر اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ وہ اسے اس بات کے لیے بے چین رکھتا ہے کہ حق سے محروم بندگان خدا کو اس خزانہ سعادت کی کنجیاں مہیا کر دے جس کے پالینے کے بعد وہ کبھی بھوکے ہوں گے نہ ننگے (ان لا تجوع فیہا ولا تعریٰ) نہ انہیں اپنے مستقبل کا کوئی اندیشہ ہو گا نہ اپنے ماضی اور حال کا کوئی غم (لا خوف علیہم ولا ھم یحزنون) اس کی ایمانی فکر و نظر اسے بتاتی رہتی ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ اگر یہ بنیادی اور مقدم ترین خیر خواہی نہ کی گئی تو باقی ساری ہمدردیاں اور خیر خواہیاں بالکل ہیچ ہیں اور ان سے خدا کے بندوں کے حقوق ہرگز نہ ہوں گے اور خدا کے بندوں کے حقوق کا ادا نہ ہو نا خود اس کے حقوق سے عہدہ برآنہ ہونے کی دلیل ہے۔

ایمان، اسلام اور تقویٰ سے امر بالعمروف کے یہ دو داخلی اور فطری تعلق تھے۔ ان کے علاوہ ان سے اس کا ایک خارجی تعلق اور مصلحتی تعلق بھی ہے۔ جسے ہم دعوت اسلامی کا سیاسی مفاد کہہ سکتے ہیں۔ یعنی امر بالمعروف اسلام و ایمان کا فطری مطالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ایک سیاسی ضرورت بھی ہے اور وہ یہ کہ دعوت اسلامی کا علمبردار گروہ امر بالمعروف کا فریضہ بجالا کر ہی اپنے ایمانی جوہر کو پوری طرح برقرار رکھ سکتا ہے۔ اور اپنے مقصد کے حصول میں پوری طرح کامیاب ہو سکتا ہے اس کے مختلف وجوہ ہیں:-

۱۔اقامت دین کی عملی جدوجہد لازماً باطل کی ایک طویل اور شدید جنگ کا دوسرا نام ہے۔ مقابلوں اور لڑائیوں کے متعلق فطرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ وہی فریق کامیاب ہوتا ہے جو اقدام کی عملی جرات رکھتا ہو، بقا اور ارتقا صرف پیش قدمی میں ہے۔ زبردست سے زبردست فوج بھی اپنے آپ کو شکست کی ذلت سے نہیں بچا سکتی اگر وہ دشمن سے مقابلے کے وقت اس پر آگے بڑھ کر حملے کرنا نہ جانتی ہو۔ اسی طرح کوئی تحریک بھی زوال وانحطاط کا شکار ہونے سے نہیں بچ سکتی، اگر وہ صرف اپنی داخلی تعمیر و تنظیم میں مصروف رہے اور اپنے بیرونی ماحول کی تسخیر کی مہم سے غافل ہو۔ اس لیے وہ جماعت جو اللہ کا دین قائم کرنے کے لیے کوشاں ہو اس وقت تک کامیابی کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ ....
طاغوتی مورچوں پر مسلسل حملے نہ کرتی رہے۔ وہ اسلحہ جس سے یہ حملے کیے جا سکتے ہیں صرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اسلحہ ہے۔
۲۔ جس طرح ایک جاندار کا جسم مختلف وجوہ سے کچھ نہ کچھ برابر تحلیل ہوتا رہتا ہے اور اسے اپنی اصل طاقت عزیزی کو بحال رکھنے کے لیے غذاؤں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے تاکہ وہ اس کی رگوں میں تازہ خون پہنچا کر اس کی زائل شدہ قوت کو واپس لاتی رہیں۔ اسی طرح اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف گروہ کو بھی ایسے مختلف اسباب اور حالات سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے جو اس کی توانائی کو متاثر کر دیا کرتے ہیں اس لیے اسے بھی اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے ایمان کو قوت بخش غذائیں دی جائیں، جو اس کے اندر خدا پرستی کی توانائیاں تازہ بتازہ داخل کرتی رہیں تاکہ وہ برابر چست رہے، فعال رہے اور ترقی کرتا رہے ورنہ رفتہ رفتہ اس کی قوت مرجھاتی چلی جائے گی۔ اور خود اس کے اپنے اوپر سے بھی دین کا اقتدار ڈھیلا ہوتا چلا جائے گا۔ ان "قوت بخش غذاؤں" میں سے جن سے یہ ایمانی توانائیاں حاصل ہوتی ہیں۔ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" بھی ایک بہترین "غذا" ہے۔
۳۔ یہ کائنات اور اس کی ہر شے طبعاً متحرک پیدا کی گئی ہیں ٹھیراؤ سے اس کی فطرت ناآشنا ہے اس لیے وہ کسی ایک حالت پر رکی نہیں رہ سکتی۔ بلکہ بڑھتی ہے کہ کسی نہ کسی سمت حرکت کرتی رہے۔ اسے اگر آگے بڑھنے کا موقع نہ ملے تو خود بخود ہی ہٹنے لگے گی۔ یہی "قانون حرکت" قیام دین کے بارے میں بھی کام کرتا ہے۔ اس کو ایک مذکورہ اور فاتح تحریک کی شکل میں برابر آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔ ورنہ جہاں اس میں رکاؤ پیدا ہوا اور اس کی اقدامی حرکت، جمود سے بدلی، وہ پیچھے ہٹنا شروع کر دے گا۔ اس اقدامی حرکت کی ایک ہی عملی شکل ہے جس کا نام امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔
یہ ہیں وہ مختلف داخلی اور خارجی پہلو جن کی بنا پر امر بالمعروف، ایمان اور اسلام اور تقویٰ ہی کا ایک قدرتی مطالبہ ہے۔

نبوی طریق کار کی شہادت

اقامت دین کا یہ طریقہ اور اس کے یہ اصول تو ہمیں قرآن سے ملتے ہیں اب اگر آپ قرآن کے معلم ﷺ کے اختیار کیے ہوئے طریق کار پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ وہی اصول جو قرآن کے اندر الفاظ کے لباس میں تھے یہاں عمل اور واقعہ کی شکل میں موجود ہیں اور نبی ﷺ نے ٹھیک انہی لائنوں پر ایک امت بنا کر اللہ کے دین کو قائم کیا تھا۔
آپ ﷺ نے عرب کے اندر، جس کا چپہ چپہ دین طاغوت کی آہنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا اپنی سعی وجدوجہد کی ابتدا ایک کلمے سے کی۔ جس کا عملی مفہوم یہ تھا کہ انسان اپنے تمام افکار و خیالات، جذبات و میلانات، اور اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات کو اس اللہ کے تابع فرمان بنا دے جس کے سوا اس زمین پر کسی کو اپنی مرضی منوانے اور اپنا حکم چلانے کے استحقاق نہیں۔ یہ نامانوس آواز جن بہرے کانوں سے سنی گئی اور اس کو دبانے کے لیے جن انسانیت سوز مظالم سے کام لیا گیا ان سے کوئی صاحب نظر ناواقف نہیں ہے۔ سیاسی حالات نے آنکھیں دکھائیں، وطنی مفاد نے آڑے آنے

کی کوشش کی، وقت اور ماحول نے ساتھ دینے سے انکار کیا۔ مصلحتوں نے دامن پکڑا، مشکلات نے راستہ روکا، ہلاکتوں کا طوفان نمودار ہوا، مگر اللہ کے اس بندے نے اپنی آواز میں کبھی کوئی پستی نہیں آنے دی۔ اور حالات زمانہ، رفتار واقعات اور مستقبل کے امکانی خدشات، غرض ہر چیز سے آنکھیں بند کر کے برابر اسی حقیقت کو دوسروں پر کھولتا رہا جو خود پر کھل چکی تھی اور باوجود اس کے وہ اپنے عقیدۂ توحید اور تصور زندگی میں بالکل اکیلا تھا لیکن اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارہ نہ کیا کہ اس عقیدے اور تصور کو چھپائے رکھے حالانکہ پوری دنیا اس کی زبان بندی پر کمربستہ تھی۔ بالآخر اس دعوت حق نے دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا اور جن لوگوں کے اندر قبول حق کی صلاحیتیں ابھی زندہ تھیں وہ ایک ایک دو دو کر کے آپ ﷺ کے حلقہ اطاعت میں آنے لگے۔ آپ نے ان کے اندر سب سے پہلے خدائے واحد کی غلامی اور پرستش کا گہرا نقش بٹھایا اور اصولی طور پر ان کو یہ بات سمجھادی کہ رضا صرف اسی کی چاہو، کیونکہ وہی ہے جس نے تمہیں زندگی بھی عطا کی ہے اور زندگی کو بسر کرنے کا سامان بھی دیا ہے اور حکم صرف اسی کا مانو! کیونکہ اس کے سوا سب تمہاری ہی طرح عاجز اور غلام ہیں۔ اسی طرح اپنی مسلسل تعلیم و تربیت سے آپ ﷺ نے ان کے دلوں کو ایک خدا کی بندگی کا ایسا گرویدہ بنادیا کہ دین توحید کے دشمنوں نے اپنے ترکش ظلم وانتقام کے سارے تیر خالی کر دیئے مگر کسی بندہ مومن کا دل توحید کی محبت سے خالی نہ کر سکے۔

اس تعلیم و تربیت اور تزکیہ کے ساتھ ساتھ ان سب لوگوں کو جو حلقہ اسلام میں داخل ہوتے جا رہے تھے، آپ ﷺ ایک خاندان کے افراد کی طرح باہم جوڑتے گئے۔ یہ جڑنا اخلاقی طور سے اتنا پائیدار تھا کہ بھائی بھائی کے رشتے اس کے سامنے ماند پڑ گئے اور آگے چل کر اجتماعی و سیاسی نقطہ نگاہ سے بھی اتنا منضبط نکلا کہ آج تک دنیا کی کوئی تنظیم اس کی یکتائی کو چیلنج نہ کر سکی۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے اہل ایمان کو جو غیر معمولی ہدایتیں دیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اور پھر جس طرح ان ہدایتوں پر انہوں نے عمل کیا وہ بھی دنیا پر روشن ہے۔ زندگی کے پیش آمدہ مسائل اور معاملات میں جس موقع پر بھی منظم اجتماعیت کا کوئی رنگ پیدا کرنے کی گنجائش نظر آئی، آپ ﷺ نے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ خواہ معاملہ کتنی ہی معمولی قسم کا کیوں نہ ہوتا۔ حد یہ ہے کہ اگر تین آدمی ایک ساتھ کسی سفر پر بھی جاتے تو آپ ﷺ کی ہدایت ہوتی کہ وہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں اور اس کی سرکردگی میں سفر کریں۔ (اذا کان ثلاثة فی سفر فلیومروا احدھم۔ مشکوۃ) مسلمانوں کے ذہن میں اس طرح اجتماعیت کی اہمیت پیوست کرتے اور انہیں ایک جسم کے اعضاء کی طرح باہم جوڑتے ہوئے آپ ﷺ نے اس امر کا بھی پورا اہتمام فرمایا کہ افتراق وانتشار کے عوامل اس اتحاد میں رخنے نہ پیدا کرنے پائیں۔ اس غرض سے آپ ﷺ نے انہیں پوری طرح متنبہ کر دیا کہ امت کا یہ اتحاد واختلاف عام قسم کی صرف ایک "سیاسی" ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ ایک خالص دینی ضرورت ہے اور اس کے بغیر وہ کام کسی طرح پورا ہی نہیں ہو سکتا جس کے لیے میری بحیثیت ایک نبی کے، اور تمہاری بحیثیت ایک امت کے بعثت ہوئی ہے۔ اللہ کی نصرت بھی تمہارے سروں پر اپنا سایہ اسی وقت ڈالے گی، جب تم جماعت (ایک منظم پارٹی) کی شکل میں رہو (ید اللہ علی الجماعة) اگر کوئی شخص اس جماعتی نظام سے بالشت بھر بھی الگ ہو گیا تو گویا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا قلادہ نکال پھینکا۔ (من خرج من الجماعة قید شبر فقد خلع ربقة السلام من عنقة الا ان یراجع۔ ترمذی) اور اسی علیحدگی کی حالت میں اگر وہ مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی۔ (من مات وھو مفارق للجبعاعت مات میتة الجاھلیة۔ مسلم) ملت کے مقدس شیرازے پر جو شخص بھی افتراق کی قینچی چلانے کی کوشش کرے اس کی گردن مار دینا۔ (من اراد ان یفترق امر ھذہ الامة وھی جمیع فاضربوہ بالسیف کائناً من کان۔ مسلم)

ان دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی اہل ایمان اللہ کے دین کو اس کے دوسرے بندوں تک پہنچانے میں برابر مصروف رہتے اور جس کسی کو جاہلیت کی نجاستوں میں آلودہ پاتے اسے ان سے پاک کر کے ایک خدا کا پرستار، ایک آقائے حقیقی کا غلام، اور ایک حاکم مطلق کا محکوم بنانے کی کوشش کرتے رہتے۔ جس بدی کو دیکھتے اس کو مٹانے کے درپے ہو جاتے۔ اور کفر وفساد کے جس طوفان سے رحمت حق نے

انہیں نجات دی تھی اس میں دوسروں کو ڈوبتے دیکھنا انہیں کسی حال میں بھی گوارا نہ ہوتا۔ یہ دعوتی جدوجہد مکہ میں تیرہ برس تک چل پائی تھی کہ دشمنان حق کے لیے اس کی کامیابی اور روز افزوں ترقی ناقابل برداشت ہوگئی اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کے قتل کی سازش کرکے اس دعوت کو فنا کر دینا چاہا۔ اس لیے آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے پیروؤں نے اپنے عزیز وطن کو خیر باد کہہ دیا اور مدینہ جاکر اسے اپنے مشن کا مرکز بنایا۔ جب کفار نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا اور ادھر اہل ایمان کی ایک منظم جمعیت بھی فراہم ہو چکی تھی تو اب بدی کی جڑیں کاٹ کر رکھ دینے اور نیکی اور انصاف کی بقا کے لیے آخری شکل اختیار کی گئی۔ یعنی منکر کو مٹا دینے کے لیے دل وزبان کی کوششوں کے علاوہ اب ہاتھ کی بھی کوششیں شروع کر دی گئیں۔ ایک مدت تک طاغوتی طاقتیں خود بخود بڑھ کر مدینہ پر حملہ آور ہوتی رہیں۔ اور آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی صرف مدافعت کرتے رہے اس مدافعت میں انہوں نے جان ومال کی ہر ممکن قربانی دے کر حق کی شہادت ادا کی۔ یہاں تک کہ اس مدافعانہ پالیسی ہی کے دوران کفر کی شوکت ٹوٹنے لگی۔ اور آخر کار عرب میں طاغوت کا علم سرنگوں ہو گیا۔ اسے دیکھ کر مسلمانوں کا دل اللہ کی تائید و نصرت پر شکر اور مسرت کے جذبات سے بھر گیا مگر اس کے باوجود ان کے لیے اپنی کمریں کھول لینے کا ابھی کوئی موقعہ نہ تھا اس لیے ان کی سواریوں کے کجاوے اسی طرح بندھے کے بندھے رہے کیونکہ اگرچہ عرب میں بدی نے ہتھیار ڈال دیئے مگر اس کے باہر ہر طرف اس کی حکمرانی پوری شان کے ساتھ قائم تھی اور مسلمان اپنے فرض کو بھول نہیں سکتا تھا کہ منکر کو مٹا دینا چاہیے خواہ وہ کہیں بھی ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ان تفصیلات سے یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید ہو یا سنت رسول ﷺ، ہر ایک سے اقامت دین کے یہی تین بنیادی اصول معلوم اور متعین ہوتے ہیں۔ اس لیے اس فرض کو ادا نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ ان تینوں اصولوں پر پورے عزم واستقلال کے ساتھ عمل نہ کیا جائے لیکن اس سلسلے میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اس عمل درآمد میں کوئی ایسی زمانی ترتیب ہے جس کی رو سے ضروری ہے کہ جب پہلے اصول پر پوری طرح عمل ہو لے تب دوسرے کی ابتداء کی جائے اور جب دوسرے اصول کی پیروی کا حق ادا ہو جائے تب کہیں جاکر تیسرے کا نام لیا جائے۔ اس کے برعکس صحیح بات یہ ہے کہ ان تینوں اصولوں پر عمل بیک وقت شروع ہو جانا چاہیے اور اگر اس عظیم مہم کے شروع کرنے سے پہلے کسی بات کی ضرورت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ ذہن کی پوری یکسوئی اور دل کی سچی شہادت کے ساتھ انسان کا لا الہ الا اللہ اور محمد الرسول اللہ پر ایمان ہو۔ اس یقین واقرار کے بعد جب ایک شخص یا ایھا الذین اٰمنوا سے مخاطب کیے جانے والے گروہ میں داخل ہو گیا، تو قرآن ایک ہی ساتھ اس کے سامنے اپنے یہ تینوں اصول رکھ دیتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنے حالات اور اپنی استطاعت کے مطابق ان پر عمل کرے۔

اس بات کی سب سے بڑی دلیل، کہ ان اصولوں پر عمل ایک ساتھ ہونا چاہیے یہ ہے کہ ان میں عملی پیروی کے لحاظ سے تفریق کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں، کیونکہ دوسرے اور تیسرے اصول اپنی حقیقت کے اعتبار سے اپنی ایسی کوئی مستقل بالذات نوعیت رکھتے ہی نہیں کہ ان کے وجود میں پہلے اصول کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس کے بخلاف حقیقت یہ ہے کہ وہ اسی اصل کی شاخیں ہیں یا کم از کم یہ کہ اس کے راست تقاضوں میں شامل ہیں۔ اور انہیں اختیار کیے بغیر خود اس پر عمل کا حق بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ اس طرح دوسرے اور تیسرے نکتوں پر عمل پیرا ہونا در اصل پہلے ہی نکتے کے اتباع کو مکمل کرنا ہے۔

اس دعوے کی صحت معلوم کرنے کے لیے اس کے علاوہ اور کسی بحث کی ضرورت نہیں کہ تقویٰ کے صحیح اور کامل عملی مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ جسے اوپر کی سطروں میں ابھی جلد ہی واضح بھی کیا جا چکا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے سارے احکام کی ٹھیک ٹھیک پیروی کا اور اس کی قائم کی ہوئی جملہ حدود کی پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ اس بات کو اگر ذہن میں پوری طرح مستحضر کر لیا جائے تو یہ حقیقت آپ سے

آپ روشن دکھائی دینے لگے گی کہ اقامت دین کے آخری دو اصول فی الواقع پہلے ہی اصول کے اجزاء یا اس کے قریب ترین تقاضے ہیں۔اور یہ اس لیے کہ اپنے نصب العین کی خاطر تمام اہل ایمان کا متحد و منظم ہونا اور امر بالمعروف کو اپنی ایمانی زندگی کا شعار بنائے رکھنا بھی کتاب و سنت کی رو سے انہی احکام و حدود میں داخل ہے جن کی پیروی اور پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ چنانچہ پہلے باہمی اتحاد کے بارے میں چند آیتوں کی شہادت سنیے:۔

۱۔یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصادقین (توبہ:۱۱۹)

اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے مومنوں کے ساتھ رہو۔

۲۔انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم و اتقوا اللہ تعلکم ترحمون (حجرات:۱۰)

"اہل ایمان تم آپس میں بھائی بھائی ہو سو اپنے بھائیوں کے درمیان (اختلاف و عناد پیدا ہو جانے کی صورت میں) صلح کرادو۔اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ اس کی رحمت سے سرفراز ہو سکو۔"

۳۔و تقوہ و اقیموا الصلوۃ ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم و کانو شیعاً کل حزب بما لدیھم فرحون (روم:۳۱،۳۲)

"اس کا تقویٰ اختیار کرو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو۔یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے اور اب ہر گروہ اپنے اپنے خیالات و افکار میں مگن ہے۔"

ان آیتوں میں پہلی آیت کے اندر سچے مومنوں سے جڑ کر رہنے کو، اور دوسری کے اندر باہم پھٹے ہوئے مومن دلوں کے دوبارہ جوڑ دینے کو "اتقا" سے تعبیر کیا گیا ہے اور تیسری آیت میں ایک طرف تو ملی انتشار کو شرک کا خلاصہ قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ کہا گیا ہے کہ ملی اتحاد توحید کا خاصہ ہے۔دوسری طرف اس میں توحید کے ماننے والوں سے تقویٰ اور اقامت نماز کا مطالبہ کیا گیا ہے ان دونوں چیزوں میں سے ایک (یعنی تقویٰ) تو توحید کا باطن ہے اور دوسرا (یعنی نماز) اس کا ظاہر ہے یہ سب باتیں اس امر پر صاف دلالت کرتی ہیں کہ ملی انتشار تقویٰ اور نماز دونوں کی روح کے یکسر منافی ہے جماعتی اتحاد اور تنظیم تقویٰ کی ضروری اور اہم ترین علامتوں میں سے ایک علامت ہے اور اس کا موجود نہ ہونا صحیح تقویٰ کے نہ ہونے کا ثبوت ہے۔

اس کے بعد کچھ دوسرے نصوص ملاحظہ ہوں جن میں سے اسی طرح امت بالمعروف کو بھی صلاح و تقویٰ کا کام قرار دیا گیا ہے:

۱۔یومنون باللہ و الیوم الاخر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و یسارعون فی الخیرت .... واللہ علیم بالمتقین (آل عمران "۱۱۴، ۱۱۵)

"یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں معروف کا حکم دیتے ہیں منکر سے روکتے ہیں اور اچھے کاموں میں تیز گام رہتے ہیں.................. اور اللہ متقیوں سے واقف ہے۔

۲۔یا ایھا الذین آمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار و لیجدوا فیکم غلظۃ واعلموا ان اللہ مع المتقین (توبہ:۱۲۳)

"اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمہارے قریب میں ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں، یاد رکھو اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔"

پہلی آیت میں مطلقاً ہر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو متقیوں کی صفات اور تقویٰ کے اعمال میں شامل کیا گیا ہے اور دوسری میں نہی عن المنکر کی ایک خاص شکل، یعنی دین کے دشمنوں سے لڑنے کو تقویٰ سے موسوم کیا گیا ہے۔

اب ایک اور آیت سنیے، جو ان دونوں حقیقتوں کی جامع ہے:۔

و المومنون و المومنات بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر (توبہ)

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں سب آپس میں ایک دوسرے کے "ولی" ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

اس آیت نے ملی اتحاد اور امر بالمعروف دونوں چیزوں کو ایمان کے اعمال اور متقضیات کی حیثیت سے ایک ہی ساتھ جمع کر دیا ہے۔

ان تمام آیات کی روشنی میں اس وہم کی تاریکی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ جب اقامت دین کے پہلے نکتہ پر پورا پورا عمل نہ ہو اور انسان کا باطن نور تقویٰ سے اچھی طرح جگمگا نہ جائے اس وقت تک اس کے لیے دوسرے اور تیسرے نکتوں کی طرف توجہ کرنا صحیح نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ خیال آج ایک واقعہ بن کر ہمارے بے شمار ذہنوں پر مسلط ہے اور اس نے دین کی خدمت و نصرت کے بارے میں ہمارے فکر و عمل کے زاویے بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ نصرت دین کی جو گاڑی تین پہیوں پر چلائی جانی چاہیے تھی اور جو ان تین پہیوں کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ اسے صرف ایک پہیے سے چلانے کی عجیب و غریب کوشش ہو رہی ہے، جس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ نکل رہا ہے کہ یہ گاڑی ایک انچ بھی آگے بڑھنے کے بجائے اپنی جگہ کھڑی زمین میں کچھ اور دھنستی ہی جا رہی ہے۔ دراصل یہ خیال ایک زبردست حجاب ہے جو ہمارے اکثر نیکوکار افراد کی بصیرتوں پر خاص طور سے پڑا ہوا ہے اس کا ظاہری پہلو یقیناً لگاؤ نہیں رکھتا جب ایک شخص سچا متقی بن ہی اس وقت سکتا ہے جب وہ اہل ایمان گروہ سے مربوط بھی رہے اور اپنی سکت بھر امر بالمعروف کا فرض بھی انجام دیتا رہے۔ تو یہ کہنا کتنا بے معنی ہوگا کہ آدمی پہلے کامل اور معیاری متقی بن لے تب کہیں جا کر ملی اتحاد و تنظیم اور امر بالمعروف کی مہمات کا آغاز کرے۔ ان تینوں نکات کی مثال تو بالکل ایک درخت کے اجزاء کی سی ہے، جس طرح بیج سے جوں ہی ننھا سا پودا اگتا ہے اس میں جڑ، اور پتے سب کی تخلیق ہو جاتی ہے اور یہ تینوں چیزیں ایک ساتھ نمو پاتی اور پروان چڑھتی رہتی ہیں، ایسا نہیں ہوتا کہ بیج سے جڑ نکل کر خوب موٹی تازی ہو لیتی ہے تب اس سے تنا نکلتا ہے اور تنا اپنی پوری بالیدگی کی حد کو پہنچ جاتا ہے تب جا کر اس میں سے پتیاں نکلنی شروع ہوتی ہیں.......................... اسی طرح قلب انسانی میں جب ایمان کا بیج جگہ پکڑتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس سے صرف تقویٰ کی جڑ ہی نکلتی ہو اور نکل کر ایک مدت دراز تک خوب موٹی تازی اور مضبوط ہوتی رہتی ہو۔ تب کہیں جا کر اتحاد ملی اور امر بالمعروف کا موقع آتا ہو بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ساتھ ہی ساتھ اس سے ملی اتحاد اور امر بالمعروف کی شاخیں اور پتیاں بھی نکلنے لگتی ہیں۔ پھر زمین کی زرخیزی اور بیج کی عمدگی کے مطابق تقویٰ کی جڑ جس قدر گہری اترتی جاتی ہے اسی قدر شاخیں اور پتیاں بھی بلند و بالا اور سرسبز و شاداب ہوتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ کا منظر سامنے آجاتا ہے۔

تمت بالخیر بحمد اللہ تعالیٰ